

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

”ضعیف + ضعیف = حسن“ کی حجت؟

امام ترمذی رحمہ اللہ اور ان کی اصطلاح ”حسن“

”حسن“ حدیث کے محث میں امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ”حسن“ ایک معرکتہ الآراء قول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُصول حدیث یا فرق حدیث کے بیان میں جن لوگوں نے حدیث ”حسن“ کے بارے میں ذرا بھی تفصیلی بات کی ہے، لازماً اس ضمن میں امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ”حسن“ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب العلل الصغیر میں اپنی اصطلاح ”حسن“ کی وضاحت بھی کی ہے لیکن پھر بھی اس کے سمجھنے میں علمائے کرام کے اقوال مختلف ہو گئے ہیں۔

یہ بات تو سب کو تسلیم ہے کہ اگر خود قائل اپنی کسی بات کی قولی یا فعلی تشریح کر دے تو دوسرے لوگوں کے بیان کیے گئے مفہوم کے مقابلے میں وہی معتبر ہوتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم جامع ترمذی میں خود امام ترمذی رحمہ اللہ کے طرز عمل کی روشنی میں ان کی اصطلاح ”حسن“ کا صحیح معنی و مفہوم قارئین کی نظر کریں گے۔

سب سے پہلے تو ہم وہ تعریف ذکر کرتے ہیں جو خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی اصطلاح ”حسن“ کے بارے میں ذکر کی ہے، فرماتے ہیں:

وَمَا ذَكَرْنَا فِي هَذَا الْكِتَابِ : حَدِيثٌ حَسَنٌ ، فَإِنَّمَا أَرَدْنَا بِهِ حُسْنَ إِسْنَادِهِ ، عِنْدَنَا كُلُّ حَدِيثٍ يُرْوَى ، لَا يَكُونُ فِي إِسْنَادِهِ مَنْ يُتَّهَمُ بِالْكَذِبِ ، وَلَا يَكُونُ الْحَدِيثُ شَاذًا ، وَيُرْوَى مِنْ غَيْرِ وَجْهِ نَحْوَ ذَلِكَ فَهُوَ عِنْدَنَا حَدِيثٌ حَسَنٌ .

”ہم نے اس کتاب میں حدیث حسن کی جو اصطلاح ذکر کی ہے، اس سے مراد سند کا حسن ہونا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر وہ حدیث جس کی سند میں نہ کوئی راوی متہم بالکذب ہو نہ وہ حدیث شاذ ہو، نیز وہ اسی طرح کی اور سند سے بھی مروی ہو، وہ حدیث حسن ہے۔“

(العلل الصغیر للترمذی مندرجہ فی آخر جامع الترمذی : ص ۸۹۸، طبع دار السلام بالریاض)

اس تعریف میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اصطلاح ”حسن“ میں تین شرائط ذکر کی ہیں:

① اس کی سند میں کوئی متہم بالکذب راوی نہ ہو۔

② وہ حدیث شاذ نہ ہو۔

③ اس کی سندیں ایک سے زائد ہوں۔

جس شرط کی بنا پر اس تعریف کو سمجھنے میں اختلاف واقع ہوا ہے، وہ تیسری شرط ہے۔ اس شرط میں مذکور ایک سے زائد سندوں کا کیا مطلب ہے؟ اس بارے میں مختلف خیالات کی وجہ سے بعد والے محققین کی آراء مختلف ہوئی ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں اس سے مراد کسی حدیث کی ایک سے زائد ایسی کمزور سندیں ہیں جن سب میں تھوڑی تھوڑی کمزوری ہوتی ہے لیکن ان زیادہ سندوں کی وجہ سے وہ حدیث قابل حجت ”حسن“ بن جاتی ہے۔ لیکن یہ بات دلائل کی رو سے درست نہیں۔ خود امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے جو منہج جامع ترمذی میں ”حسن“ کے حوالے سے اپنایا ہے، وہ بھی اس نظریے کو سختی سے مسترد کرتا ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ”حسن“ کی تعریف اور جامع ترمذی رحمۃ اللہ علیہ میں اس کے اطلاق کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ امام صاحب کی ایک خاص اصطلاح ہے جو عام محدثین سے مختلف ہے۔ تعریف میں عِنْدَنَا (ہمارے نزدیک) کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں۔ اگر اس سے محدثین کرام والی ”حسن“ جو کہ قابل حجت ہوتی ہے، مراد ہوتی تو اس تعریف میں اپنے لیے خصوصیت کا تذکرہ نہ ہوتا بلکہ سرے سے اس وضاحت کی ہی ضرورت نہ ہوتی۔ اس ہمارے دعوے پر جامع ترمذی میں امام صاحب کے بہت سے اطلاقات حسن بھی ہمارے لیے دلیل ہیں۔ ہم اس سلسلے میں صرف وہ مقامات زیر بحث لائیں گے جہاں امام صاحب نے صرف حَدِيثٌ حَسَنٌ کہا ہے، کیونکہ حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ اور حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ میں تو شاید کوئی اور احتمال ہو سکتا ہو اور بعض محققین نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ جب امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ صرف ”حسن“ کہیں تو ان کی یہ مراد ہوگی ورنہ نہیں۔ لہذا آئیے اس مسئلے کی تحقیق کی غرض سے جامع ترمذی سے صرف ”حسن“ کی ایک دو مثالیں ملاحظہ کرتے ہیں:

① امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے جو حَدِيثٌ حَسَنٌ کا اطلاق کیا ہے، وہ



ملاحظہ فرمائیں۔ امام صاحب سر مسح کی احادیث ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بَابُ مَا جَاءَ فِي مَسْحِ الرَّأْسِ أَنَّهُ يُبَدَأُ بِمُقَدِّمِ الرَّأْسِ إِلَى مُؤَخَّرِهِ .

”اس حدیث کا بیان جس میں یہ ذکر ہے کہ سر کے مسح کو سر کے اگلے حصے سے شروع کیا

جائے گا۔“ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ : أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ مَسَحَ رَأْسَهُ بِيَدَيْهِ، فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَذْبَرَ، بَدَأَ بِمُقَدِّمِ رَأْسِهِ ثُمَّ ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى

قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. قَالَ أَبُو

عِيسَى: وَفِي الْبَابِ عَنْ مُعَاوِيَةَ وَالْمُقَدِّمِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ وَعَائِشَةَ، قَالَ أَبُو

عِيسَى: حَدِيثُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي هَذَا الْبَابِ وَأَحْسَنُ، وَبِهِ يَقُولُ

الشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَإِسْحَاقُ. ”سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ اپنے سر کا دونوں ہاتھوں کے ساتھ یوں مسح فرماتے کہ اپنے سر کے اگلے حصے سے

شروع کرتے حتیٰ کہ دونوں ہاتھوں کو اپنی گدی مبارک تک لے جاتے۔ پھر ان کو واپس لوٹاتے حتیٰ

کہ اس جگہ تک آ جاتے جہاں سے مسح شروع کیا تھا، پھر اپنے پاؤں مبارک دھوتے۔ اس مسئلے

میں سیدنا معاویہ، سیدنا مقدم بن معدیکرب اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے احادیث مروی ہیں۔ سیدنا

عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث اس (سر کے مسح کے) مسئلے میں صحیح ترین اور بہترین ہے۔ امام

شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم کا مذہب اسی حدیث کے مطابق ہے۔“

اس کے بعد فرماتے ہیں: بَابُ مَا جَاءَ أَنَّهُ يُبَدَأُ بِمُؤَخَّرِ الرَّأْسِ .

”اس حدیث کا بیان جس میں یہ ذکر ہے کہ سر کا مسح سر کے پچھلے حصے سے شروع کیا جائے

گا۔“ پھر امام صاحب یہ حدیث بیان فرماتے ہیں:

..... عَنْ الرَّبِيعِ بْنِ مَعُوذٍ بْنِ عَفْرَاءَ : أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَسَحَ بِرَأْسِهِ مَرَّتَيْنِ بَدَأَ بِمُؤَخَّرِ رَأْسِهِ ثُمَّ بِمُقَدِّمِهِ وَبِأُذُنَيْهِ كَلْتَيْهِمَا ظَهْرَهُمَا

وَبُطُونَهُمَا. قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ، وَحَدِيثُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ

أَصَحُّ مِنْ هَذَا وَأَجُودُ إِسْنَادًا، وَقَدْ ذَهَبَ بَعْضُ أَهْلِ الْكُوفَةِ إِلَى هَذَا الْحَدِيثِ،

مِنْهُمْ وَكَيَعُ بْنُ الْجَرَّاحِ .

”سیدہ رُبیع بنت عفراء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر کا دو مرتبہ مسح کیا۔ اپنے سر کے پچھلے حصے سے شروع کیا پھر اگلے حصے کا مسح کیا اور اپنے دونوں کانوں کی اندرونی و بیرونی جانب مسح کیا۔ یہ حدیث حسن ہے، جبکہ سیدنا عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث صحیح تر اور سند کے اعتبار سے زیادہ عمدہ ہے۔ بعض اہل کوفہ اس حدیث کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے امام وکیع بن جراح رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔“ (جامع الترمذی: ۳۲، ۳۳، طبع دار السلام، بالریاض)

جامع ترمذی میں یہ سب سے پہلا مقام ہے جہاں امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے کسی حدیث کے لیے حَدِيثٌ حَسَنٌ کا اطلاق کیا ہے۔ اور یہاں کتنے صاف الفاظ میں امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے اپنی ”حسن“ کو خود مرجوح اور ناقابل عمل قرار دیا ہے۔ اگر امام ترمذی رضی اللہ عنہ کی ”حسن“ سے مراد قابل حجت و قابل عمل حدیث ہوتی تو وہ کبھی ایک حدیث کو ”حسن“ کہنے کے ساتھ ساتھ اس پر ایسا تبصرہ نہ فرماتے۔

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس حدیث کا دار و مدار عبد اللہ بن محمد بن عقیل پر ہے جیسا کہ علامہ عبد الرحمن محدث مبارکپوری رضی اللہ عنہ، علامہ شوکانی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حَدِيثُ رَبِيعِ بِنْتِ مُعَوِّذٍ هَذَا لَهُ رَوَايَاتٌ وَأَلْفَاظٌ، مَدَارُ الْكُلِّ عَلَى عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَقِيلٍ، وَفِيهِ مَقَالٌ مَشْهُورٌ لَا سِيَّمَا إِذَا عَنَعْنَا، وَقَدْ فَعَلَ ذَلِكَ فِي جَمِيعِهَا.

”سیدہ رُبیع بنت معوذہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کی کئی سندیں اور کئی الفاظ ہیں۔ سب کا دار و مدار عبد اللہ بن محمد بن عقیل پر ہے اور ان کے بارے میں (محدثین کی) کلام (جرح) مشہور ہے خصوصاً جب وہ عَنَ کے لفظ سے بیان کریں۔ تمام سندوں میں انہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔“ آخر میں مبارکپوری رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

وَهُوَ مَذْهَبٌ مَرْجُوحٌ، وَالْمَذْهَبُ الرَّاجِحُ الْمُعَوَّلُ عَلَيْهِ هُوَ الْبَدَاءُ بِمُقَدِّمِ الرَّأْسِ.

”یہ مرجوح مذہب ہے۔ رائج مذہب جس پر اعتماد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سر کا مسح سر کے اگلے حصے سے شروع کیا جائے۔ (تحفة الاحوذی: ۱/۱۱۲، ۱۱۳، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

یعنی اس حدیث کی پورے ذخیرہ حدیث میں کوئی ایسی سند نہیں جس میں عبد اللہ بن محمد بن عقیل موجود نہ ہو، جبکہ زیادہ ”ضعیف“ سندوں کے آپس میں مل کر ”حسن“ ہونے کے جو علمائے

کرام قائل ہیں، ان کے نزدیک یہ حدیث اس وقت تک ”حسن“ نہیں بن سکتی جب تک عبد اللہ بن محمد بن عقیل کی متابعت موجود نہ ہو۔ پھر اس حدیث کے شواہد (مؤید احادیث) بھی موجود نہیں جیسا کہ خود امام ترمذی رحمہ اللہ کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اگر اس کا کوئی شاہد (مؤید حدیث) امام صاحب کی نظر میں ہوتا تو وہ اسے اپنے اسلوب کے مطابق وَفِي الْبَابِ کہہ کر ذکر کر دیتے۔ اگر کسی صاحب علم کے پاس اس حدیث کی کوئی اور سند یا کوئی شاہد موجود ہو تو وہ اسے افادہ عام کے لیے پیش کرے۔

یہ تھی پہلی حدیث جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”حسن“ قرار دیا ہے اور اسی حدیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ”حسن“ کا مطلب امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک قطعاً یہ نہیں کہ اس کی ایک سے زائد خفیف ”ضعف“ والی سندیں ہیں اور وہ مل کر قابل حجت بنتی ہیں۔ ایک مقام پر امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن محمد بن عقیل صدوق (معتبر) راوی ہیں۔ اگرچہ بعض محدثین کرام نے ان کے حافظے پر جرح کی ہے۔

(جامع الترمذی، تحت الحديث: ۳، طبع دار السلام، بالریاض)

اگر بالفرض امام صاحب اس کا یہ خفیف ”ضعف“ دُور کرنا چاہتے ہوتے تو اس کی کوئی اور سند یا کوئی شاہد پیش کرتے اور اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کے خلاف پہلی حدیث کو راجح قرار نہ دیتے۔

② امام ترمذی رحمہ اللہ رفع الیدین کی احادیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بَابُ مَا جَاءَ فِي رَفْعِ الْيَدَيْنِ عِنْدَ الرُّكُوعِ .

”ان احادیث کا بیان جن میں رکوع کرتے وقت رفع الیدین کا ذکر ہے۔“

..... عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتَّى يَحَازِيَ مَنْكِبَيْهِ، وَإِذَا رَكَعَ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَزَادَ ابْنُ أَبِي عُمَرَ فِي حَدِيثِهِ: وَكَأَنَّهُ لَا يَرْفَعُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ وَفِي الْبَابِ عَنْ عُمَرَ وَعَلِيِّ وَوَائِلِ بْنِ حُجْرٍ وَمَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ وَأَنَسٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ وَأَبِي حُمَيْدٍ وَأَبِي أُسَيْدٍ وَسَهْلِ بْنِ سَعْدٍ وَمُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ وَأَبِي قَتَادَةَ وَأَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ وَجَابِرٍ وَعُمَيْرِ اللَّيْثِيِّ، قَالَ أَبُو عِيسَى: حَدِيثُ ابْنِ عُمَرَ



حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ، وَبِهَذَا يَقُولُ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِنْهُمْ ابْنُ عُمَرَ وَجَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ وَأَبُو هُرَيْرَةَ وَأَنَسُ وَابْنُ عَبَّاسٍ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ الزُّبَيْرِ وَغَيْرُهُمْ، وَمِنَ التَّابِعِينَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَعَطَاءُ وَطَاوُسٌ وَمُجَاهِدٌ وَنَافِعٌ وَسَلَامٌ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ وَسَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَغَيْرُهُمْ، وَبِهِ يَقُولُ مَالِكٌ وَمَعْمَرٌ وَالْأَوْزَاعِيُّ وَابْنُ عُيَيْنَةَ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْمُبَارَكِ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَإِسْحَاقُ، وَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْمُبَارَكِ: قَدْ ثَبَتَ حَدِيثٌ مَنْ يَرْفَعُ يَدَيْهِ، وَذَكَرَ حَدِيثَ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، وَلَمْ يَثْبُتْ حَدِيثُ ابْنِ مَسْعُودٍ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ كَانَ مَالِكٌ بْنُ أَنَسٍ يَرَى رَفْعَ الْيَدَيْنِ فِي الصَّلَاةِ، وَقَالَ يَحْيَى: وَحَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: كَانَ مَعْمَرٌ يَرَى رَفْعَ الْيَدَيْنِ فِي الصَّلَاةِ، وَسَمِعْتُ الْجَارُودَ بْنَ مُعَاذٍ يَقُولُ: كَانَ سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ وَعُمَرُ بْنُ هَارُونَ وَالنَّضْرُ بْنُ شُمَيْلٍ يَرْفَعُونَ أَيْدِيَهُمْ إِذَا افْتَتَحُوا الصَّلَاةَ وَإِذَا رَكَعُوا وَإِذَا رَفَعُوا رَأْسَهُمْ.

”سالم اپنے والد (سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما) سے بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ آپ جب نماز شروع کرتے، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو اپنے کندھوں کے برابر رفع الیدین فرماتے تھے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ آپ دونوں سجدوں کے درمیان رفع الیدین نہیں کرتے تھے..... اس مسئلے میں سیدنا عمر، سیدنا علی، سیدنا وائل بن حجر، سیدنا مالک بن حویرث، سیدنا انس، سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا ابو حمید، سیدنا ابو اسید، سیدنا سہل بن سعد، سیدنا محمد بن مسلمہ، سیدنا ابوقتاہ، سیدنا ابو موسیٰ اشعری، سیدنا جابر، سیدنا عمیر لیشی رضی اللہ عنہ سے احادیث مروی ہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے۔ بعض (بقولِ امام بخاری رحمہ اللہ تمام۔ ناقل ☆) اہل علم صحابہ کرام کا یہی مذہب ہے۔ ان صحابہ کرام میں سیدنا عبد اللہ بن

☆ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ کی بات ہی رائج ہے۔ بعض صحابہ کرام سے عدم رفع کی جو روایات مروی ہیں، ان میں سے ایک بھی اصولِ محدثین کے مطابق ثابت نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: ماہنامہ ضرب حق، شمارہ نمبر ۱۵۔

عمر، سیدنا جابر بن عبد اللہ، سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا انس، سیدنا عبد اللہ بن عباس، سیدنا عبد اللہ بن زبیر وغیرہم رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ تابعین عظام میں سے امام حسن بصری، امام عطاء بن ابی رباح، امام طاؤس، امام مجاہد، امام نافع، امام سالم بن عبد اللہ، امام سعید بن جبیر وغیرہم رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔ امام مالک، امام معمر، امام اوزاعی، امام سفیان بن عیینہ، امام عبد اللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ وغیرہم رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ امام عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رفع الیدین کرنے والے لوگوں کی دلیل، یعنی سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ثابت ہے جبکہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ثابت نہیں جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صرف پہلی دفعہ رفع الیدین کیا ہے..... امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ بھی نماز میں رفع الیدین کے قائل تھے۔ یحییٰ کا بیان ہے کہ ہمیں امام عبد الرزاق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: امام معمر رضی اللہ عنہ نماز میں رفع الیدین کرتے تھے۔ میں نے جارود بن معاذ کو یہ بیان کرتے سنا کہ امام سفیان بن عیینہ، عمر بن ہارون اور امام نصر بن شمیل نماز شروع کرتے، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے۔“

اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں: بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَرْفَعْ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ. ”اس حدیث کا بیان جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صرف پہلی دفعہ رفع الیدین کیا تھا۔“

..... عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ: قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ: أَلَا أُصَلِّي بِكُمْ صَلَاةَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَصَلَّيْ فَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ، قَالَ: وَفِي الْبَابِ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ أَبُو عِيسَى: حَدِيثُ ابْنِ مَسْعُودٍ حَدِيثٌ حَسَنٌ، وَبِهِ يَقُولُ غَيْرٌ وَاحِدٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالتَّابِعِينَ، وَهُوَ قَوْلُ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ وَأَهْلِ الْكُوفَةِ.

”علقمہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں تمہیں اللہ کے رسول ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں؟ پھر انہوں نے صرف پہلی دفعہ رفع الیدین کیا، دوبارہ نہیں کیا۔ اس بارے میں سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن



مسعود بنی اللہؓ کی حدیث حسن ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے کئی صحابہ کرام اور تابعین اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے (صحابہ کرام اور جمہور تابعین کے بارے میں یہ بات ثابت نہیں۔ ناقل)۔ امام سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔“

(جامع الترمذی، رقم الحديث: ۲۵۷، طبع دار السلام، بالریاض)

ملاحظہ فرمائیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ مؤخر الذکر حدیث پر امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی جرح پہلی حدیث کے تحت ذکر کر آئے ہیں۔ پھر اس حدیث کو ”حسن“ بھی قرار دے رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک اس اصطلاح ”حسن“ سے مراد ایسی حدیث نہیں ہوتی جو قابل حجت ہو۔

نصب الراية کے حاشیے پر ایک تعلیق تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا ابن مسعود بنی اللہؓ کی حدیث کو حجت سمجھتے ہوئے ”حسن“ کہا ہے۔ اس کا رد کرتے ہوئے ایک عرب محقق دکتور حمزہ ملیباری لکھتے ہیں:

”تعلیق لکھنے والے شخص نے کہا ہے کہ سیدنا ابن مسعود بنی اللہؓ کی حدیث امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک ثابت ہے۔ شاید یہ بات اس نے امام ترمذی رحمہ اللہ کے اس حدیث کو حسن کہنے سے اخذ کی ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا کسی حدیث کو حسن کہنے کا مقصد نبی اکرم ﷺ سے اس حدیث کا ثبوت کا اعتقاد نہیں، بلکہ صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس حدیث کے متن میں غرابت نہیں، یعنی یہ متن شاذ نہیں نیز شواہد کی وجہ سے معروف ہونے کی بنا پر غریب بھی نہیں۔ وہ شواہد نبی ﷺ سے روایت یا عمل کی صورت میں بھی ہو سکتے ہیں اور بعض صحابہ و تابعین کے قول کی صورت میں بھی ہو سکتے ہیں اگرچہ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کچھ بھی ثابت نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہم بہت سارے مقامات پر دیکھتے ہیں کہ امام صاحب حدیث کو مرفوع روایت کے اعتبار سے معلول قرار دیتے ہیں اور اس میں راوی کی غلطی واضح کرتے ہیں پھر ساتھ ہی اس کے متن کو حسن بھی کہہ دیتے ہیں جیسا کہ ہم نے اس حدیث (سیدنا عبد اللہ بن مسعود) میں دیکھ لیا ہے کہ امام صاحب نے امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی طرف سے اس حدیث میں علت بیان کی ہے۔ اس پر کوئی تعاقب بھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث ان کے

ہاں مرفوع ثابت نہیں۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اس سے حسن بھی قرار دیا ہے اور اپنے حسن کہنے کے سبب کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ کئی اہل علم صحابہ کرام اور تابعین اس کے قائل ہیں اور یہی امام سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا مذہب ہے۔ لہذا امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے کسی حدیث کو حسن قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ امام صاحب کے ہاں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے اور قابل حجت ہے.....“

(الموازنة بين المتقدمين والمتأخرين في تصحيح الأحاديث وتعليقها: ص ٨١، ملتنقى أهل الحديث)

یہ بھی ملحوظ رہے کہ محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں علت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے واقع ہوئی ہے۔ پھر اس حدیث کا مدار بھی سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ پر ہے۔ پورے ذخیرہ حدیث میں اس حوالے سے امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی متابعت کسی نے نہیں کی۔ اگر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ”حسن“ سے مراد کئی کم ضعف والی سندیں ہوتیں جو ان کے نزدیک سب کے ملنے سے ”قابل حجت حسن“ بن جاتی ہوتیں تو یہ حدیث ان کے نزدیک کبھی ”حسن“ نہ ہوتی کیونکہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے کے بغیر ذخیرہ حدیث میں اس حدیث کی کوئی سند نہیں۔

دکتور حمزہ صاحب کی یہ بات بالکل بجا ہے کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اصطلاح ”حسن“ سے قابل حجت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت حدیث مراد نہیں لیتے بلکہ بسا اوقات امام صاحب کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ اس پر صحابہ و تابعین کا عمل ہے۔ اس کی ایک مثال ہم ساتھ ہی بیان کیے دیتے ہیں۔

③ امام ترمذی رحمہ اللہ ایک حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ كَأَنَّهُ عَلَى الرَّصْفِ قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ إِلَّا أَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِيهِ، وَالْعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ يَخْتَارُونَ أَنْ لَا يُطِيلَ الرَّجُلُ الْقُعُودَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ، وَلَا يَزِيدَ عَلَى التَّشَهُّدِ شَيْئًا، وَقَالُوا: إِنْ زَادَ عَلَى التَّشَهُّدِ فَعَلَيْهِ سَجْدَتَا السَّهْوِ، هَكَذَا رَوَى عَنِ الشَّعْبِيِّ وَغَيْرِهِ .

”رسول اللہ ﷺ جب پہلی دو رکعتوں کے بعد تشہد بیٹھتے تو یوں (جلدی سے تیسری رکعت کے لیے اٹھ جاتے) جیسے گرم پتھر پر ہوں۔ یہ حدیث حسن ہے، مگر ابو عبیدہ نے اپنے والد (سیدنا



عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں کیا۔ اہل علم کا اس حدیث پر عمل ہے۔ وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ آدمی دو رکعتوں کے بعد تشہد کو لمبا نہ کرے اور تشہد سے زائد کچھ نہ پڑھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ تشہد سے کوئی چیز (درو، دُعائیں) زائد پڑھے گا تو اس پر سہو کے دو سجدے لازم ہو جائیں گے۔ امام شعبی رحمہ اللہ وغیرہ سے اسی طرح مروی ہے۔“

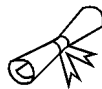
(جامع الترمذی، رقم الحدیث: ۳۶۶، طبع دار السلام، بالریاض)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث میں خود وجہ ضعف بیان کرنے کے باوجود اسے ”حسن“ قرار دیا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ پورے ذخیرہ حدیث سے اس حدیث کی کوئی ایسی سند دریافت نہیں ہو سکی جس میں ابو عبیدہ کا واسطہ نہ ہو، یعنی ابو عبیدہ اس حدیث کے مرکزی راوی ہیں اور ان کا اپنے والد سے سماع نہیں۔ پھر بھی امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے ”حسن“ قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے بعد میں بعض اہل علم کا عمل اس پر پیش کیا ہے۔ یعنی امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ”حسن“ عام محدثین کرام کی قابل حجت ”حسن“ سے ہٹ کر ایک اصطلاح ہے جس کے ضمن میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اہل علم کے عمل کی وجہ سے بھی حدیث ”حسن“ ہو جاتی ہے چاہے اس بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کچھ بھی ثابت نہ ہو سکے۔ اس سے بڑھ کر اس بات پر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی اپنی اصطلاح ”حسن“ سے مراد ایسی حدیث نہیں ہوتی جو کم ضعف والی زیادہ سندوں کے ملنے سے قابل حجت حسن بن جائے؟؟؟

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی جانب سے ”حسن“ کی تعریف میں جو ایک سے زائد سندوں سے مروی ہونے کے الفاظ ہیں، ان کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی حدیث کو کسی بھی طبقے میں ایک سے زائد راوی بیان کریں تو اس کی سندیں ایک سے زائد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہم انہی حدیثوں کو دیکھتے ہیں جو ”ضعیف+ضعیف=حسن“ کے اصول کو ماننے والوں کے ہاں بھی قابل حجت نہیں بنتیں۔ ان حدیثوں کی سندیں بھی ایک سے زائد ہیں، جیسا کہ:

① پہلی حدیث جو سر کے پچھلے حصے سے مسح شروع کرنے کے متعلق تھی اس کی سند کا

نقشہ یوں ہے:



صحابیہ سیدہ ربیع بنت معوذ



(مرکزی راوی) عبد اللہ بن محمد بن عقیل

(مصنف ابن أبي شيبة: ۳۲/۱، الرقم: ۱۵۳، طبع مكتبة الرشد، بالرياض، جامع الترمذي، رقم الحديث: ۳۳، طبع دار السلام، بالرياض، سنن أبي داود، رقم الحديث: ۱۲۶، طبع دار السلام، بالرياض، المعجم الكبير للطبراني: ۲۴/۲۶۸، طبع دار إحياء التراث العربي)

یہاں سے سندیں مختلف ہوتی ہیں

عبد اللہ بن محمد بن عقیل سے بیان کرنے والے یہ دو شاگرد ہیں:



بشر بن مفضل



سفیان بن سعید الثوری



| | |
|--|---|
| مصنف ابن أبي شيبة: ۳۲/۱، الرقم: ۱۵۳، سنن أبي داود، رقم الحديث: ۱۲۶، طبع دار السلام، بالرياض، جامع الترمذي، رقم الحديث: ۳۳، طبع دار السلام، بالرياض | طبع مكتبة الرشد، بالرياض، المعجم الكبير للطبراني: ۲۴/۲۶۸، طبع دار إحياء التراث العربي |
|--|---|

اس کے بعد سفیان ثوری سے اور بشر بن مفضل کے شاگردوں کے ایک سے زائد ہونے کی وجہ سے سندیں مزید زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہی مطلب ہے امام ترمذی رحمہ اللہ کے ”حسن“ کی اصطلاح میں ایک سے زائد سندوں کی شرط لگانے کا۔ واللہ اعلم!

② سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی عدم رفع الیہین والی ”ضعیف“ حدیث کی سندیں بھی سفیان ثوری کے بہت سے شاگردوں کی وجہ سے بہت زیادہ ہو جاتی ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ”حسن“ میں ایک سے زائد سندوں کی شرط لگانے کا مطلب یہی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی ایک سے زائد تھوڑے ضعف والی سندیں ہیں جو مل ملا کر قابل حجت ”حسن“ بن جاتی ہیں۔ ایسا کہنا امام ترمذی رحمہ اللہ کے اسلوب کے خلاف ہے۔



یہی بات سمجھ نہ پانے کی وجہ سے بعض علمائے کرام نے امام ترمذی رحمہ اللہ پر اس حوالے سے تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”حسن“ میں زائد سندوں کی شرط لگانے کے باوجود بہت سی غریب (ایک سند والی) حدیثوں کو ”حسن“ کہہ دیا ہے۔ مثلاً حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فَإِنَّهُ يَقُولُ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَحَادِيثِ: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ، لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هَذَا الْوَجْهِ. ”امام ترمذی رحمہ اللہ بہت سی حدیثوں کے بارے میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں۔“

(اختصار علوم الحديث لابن كثير: ص ۱۳۱، طبع دار المعارف، بالریاض)

حافظ عراقی رحمہ اللہ اصول حدیث کو اشعار کی صورت میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: مَا سَلِمَ مِنَ الشُّذُوذِ مَعَ رَأْيِ مَا أَتَاهُمْ
بِكَذِبٍ وَلَمْ يَكُنْ فَرْدًا وَرَدَّ قُلْتُ: وَقَدْ حَسَّنَ بَعْضُ مَا انْفَرَدَ

”امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسن حدیث وہ ہے جو شذوذ سے سلامت ہو اور اس کا کوئی راوی متہم بالکذب نہ ہو نہ وہ غریب (اکیلی) سند سے آئی ہو۔ میں (عراقی) کہتا ہوں کہ امام صاحب نے (اس تعریف کے خلاف) بعض غریب حدیثوں کو بھی حسن کہہ دیا ہے۔“

(ألفية العراقي، الرقم: ۵۲، ۵۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ”حسن“ کو اس معنی پر محمول کیا جائے کہ اس سے مراد ”ضعیف + ضعیف = حسن“ ہے تو اس سے امام ترمذی رحمہ اللہ کے قول و فعل میں تناقض لازم آتا ہے اور اس طرف بعض علمائے کرام نے اشارہ بھی کیا ہے، حالانکہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی یہ مراد نہیں۔ واللہ اعلم!

رہا حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کا ”حسن“ کی اقسام بیان کرتے ہوئے یہ کہنا کہ تھوڑے ضعف کی حامل کئی سندوں والی حدیث سب سندوں کو ملا کر ”حسن“ بن جاتی ہیں وَكَلَامُ التِّرْمِذِيِّ عَلَى هَذَا الْقِسْمِ يُتَنَزَّلُ. ”اور امام ترمذی رحمہ اللہ کی کلام کو اسی پر محمول کیا جائے گا“ تو یہ ان کی خطا ہے۔ اس کا رد کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قُلْتُ: لَا يُمَكِّنُ تَنْزِيلُهُ لِمَا ذَكَرْنَاهُ عَنْهُ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

”میں کہتا ہوں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی کلام کو اس معنی پر محمول کرنا اس وجہ سے ممکن نہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں (کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض ایک سند والی حدیثوں کو بھی حسن قرار دیا ہے) واللہ اعلم۔“ (اختصار علوم الحدیث لابن کثیر: ص ۱۳۳، طبع دار المعارف، بالریاض)

اس ساری بحث کے بعد ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی اصطلاح ”حسن“ سے ”ضعیف+ضعیف=حسن“ کا اُصول کشید کرنا کسی طور درست نہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے کہ متقدمین محدثین جو اصطلاح حدیث میں ہمارے لیے حجت ہیں، ان میں سے کسی سے یہ اُصول ثابت نہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ کوئی لفظی جھگڑا نہیں، یعنی ہمارا مطالبہ یہ نہیں کہ ہمیں متقدمین محدثین سے یہی لفظ دکھائے جائیں کہ ”ضعیف+ضعیف=حسن“، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اس اُصول کو ثابت کرنے کے لیے متقدمین محدثین سے کوئی ایسی عبارت پیش کر دی جائے جس کا یہ مفہوم ہو کہ اگر کسی حدیث کی ذخیرہ حدیث میں موجود سب سندیں تھوڑی تھوڑی ”ضعیف“ بھی ہوں تو کثرت طرق سے ضعف ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ان شاء اللہ ہمیں تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوگی۔

بعض اصحاب کے ذہن میں یہ اشکال بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اُصول کے ثبوت کے سلسلے میں متقدمین محدثین کی قید کیوں اور اُصول حدیث کے ثبوت کے لیے صرف متقدمین محدثین ہی حجت کیوں ہیں؟ تو اس کا جواب ہم ایک عرب محقق دکتور حاتم بن عارف العونی کی ایک فکر انگیز تحریر سے عرض کرتے ہیں، وہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”پہلی بات یہ ہے کہ جس شخص کو علم حدیث سے کچھ مَس ہے اسے اس بات میں کوئی تردد نہیں ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے نقاد حدیث ائمہ دین مثلاً امام یحییٰ بن معین، امام علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابو حاتم، امام ابو زرعہ، امام ابن خزیمہ، امام عقیلی، امام عبد الرحمن بن ابی حاتم، امام ابن عدی، امام ابن حبان، امام دارقطنی رحمہم اللہ اور اس دور کے دیگر علمائے حدیث، متاخرین مثلاً حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، حافظ سخاوی، علامہ سیوطی اور بعد والوں کے مقابلے میں بہت بہت گنا بڑھ کر عالم تھے۔



دوسری بات یہ ہے کہ جس شخص کو علم حدیث، علمائے حدیث اور حالاتِ محدثین سے کچھ تعلق ہے اسے اس بات میں کوئی شک نہیں مذکورہ (متقدمین) محدثین کے قلوب و اذہان سب لوگوں سے بڑھ کر ان علوم سے پاک تھے جنہوں نے اسلامی علوم میں داخل ہو کر بہت بُرا اثر چھوڑا۔ علومِ اسلامیہ پر بُرا اثر چھوڑنے والے ان علوم میں سے بطور مثال علم منطق اور اس کا پروردہ علم کلام ہے۔ متقدمین محدثین متاخرین کی طرح ان علوم سے بلا واسطہ یا بالواسطہ متاثر نہیں ہوئے جیسا کہ میں نے اس بات کی وضاحت اپنی کتاب المنہج المقترح میں کر دی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ پہلی صدیوں میں علم حدیث محدثین کے ہاں زندہ تھا کیونکہ وہی لوگ تھے جو اس کی نشو و نما کے مراحل میں اس کے ہم رکاب ہوئے تھے اور انہی (متقدمین محدثین) نے علم حدیث کو لاحق ہونے والے خطرات کا سامنا کر کے اس کا دفاع کیا تھا، نیز یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے علم حدیث کے لیے قواعد بنائے اور مکمل کیے تھے حتیٰ کہ علم حدیث اپنی تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ پھر اس زمانے کے بعد علم حدیث میں کمی شروع ہو گئی یہاں تک کہ وہ درجہٴ اجنبیت کو پہنچ گیا (جیسا کہ حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ مائل)۔

یہی وجہ ہے کہ متاخرین پر علم حدیث کے بہت سے واضح مسائل پوشیدہ رہ گئے اور ان سے اس علم کی بعض اصطلاحات مخفی ہو گئیں۔ وہ بہت سے مقامات پر زبانِ حال یا مقال سے یہ اعلان کرنے لگے کہ ان کو متقدمین کے اقوال و مناجج کو تفصیلاً پڑھنے اور ان میں غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ علم حدیث کے اُن بڑے بڑے گھمبیر مسائل اور اصطلاحات کی وضاحت ہو جائے جو متقدمین کے ہاں بہت شفاف اور واضح تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے متقدمین محدثین کو اپنی کتاب المنہج المقترح میں اہل اصطلاح کا نام دیا ہے اور متاخرین کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اہل اصطلاح نہیں ہیں کیونکہ متاخرین علماء متقدمین محدثین کی اصطلاحات کی ترجمانی کرنے والے اور ان کے نشاناتِ علم سے اُصولی و فروعی مسائل استنباط کرنے والے ہیں۔ متاخرین کا اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ وہ ہمارے لیے کتابوں کی صورت میں متقدمین کے چھوڑے ہوئے کام کی حفاظت کریں۔

اس بحث سے ہمارے سامنے دونوں فریقوں (متقدمین اور متاخرین) میں فرق ظاہر ہو گیا



ہے۔ یہ بہت بڑا فرق ہے جیسے بعض عرب وہ تھے جن کی لغت حجت تھی، وہ اہل لغت کہلاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو ان کے بعد آئے اور اس بارے میں کتب تصنیف کیں بلکہ بعض لوگ ان کے ایک عرصہ بعد آئے جبکہ علم منطق نے لغت کے علوم کو بھی اُسی طرح بگاڑ دیا تھا جیسے دیگر علوم کو بگاڑا تھا اور علم لغت بھی اُسی طرح کمزور ہو گیا تھا جیسے دیگر علوم کمزور ہو گئے تھے۔ جب متقدمین اور متاخرین کی نسبت معاملہ ایسا ہے تو بھلا اب کوئی شخص اس بات میں شک کرے گا کہ متقدمین اور متاخرین میں بہت فرق ہے؟

میرا سوال ہے کہ اگر دو آدمی کسی علم کے بارے میں بات کریں۔ ایک آدمی اس علم کا زیادہ عالم بلکہ اس علم کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ہو اور دوسرا کئی گنا کم علم رکھنے والا ہو بلکہ اس کا زیادہ سے زیادہ کام پہلے آدمی کی کلام کو سمجھنا اور اس کے منہج کی وضاحت تلاش کرنا ہو تو دونوں میں سے کون اس علم کے مسائل کی معرفت کا زیادہ اہل ہوگا اور کس کا قول زیادہ دُرست اور زیادہ صحیح ہوگا؟ اس سوال کو مزید وضاحت سے کہیں تو یوں ہوگا کہ اگر متاخرین میں سے کوئی کسی حدیث کو (متقدمین کے برعکس) صحیح قرار دے تو کیا اس کے حکم کو دُرست قرار دینے پر یہ چیزیں اثر انداز نہیں ہوں گی کہ وہ متقدمین کے مقابلے میں کم علم ہے اور اس کی سوچ و فکر کئی ایسے علوم سے متاثر ہوئی ہے جو علم حدیث سے ہٹ کر ہیں، نیز وہ ہمیشہ علم حدیث کے بعض اہم مسائل اور اصطلاحات کو سمجھنے اور ان کی وضاحت طلب کرنے کا ضرورت مند ہے؟

جب متاخرین میں سے کوئی عالم حدیث کو قبول یا رد کرنے کے بارے میں کوئی قاعدہ بنائے یا جرح و تعدیل کے اعتبار سے راویوں کے مراتب مقرر کرنے کے سلسلے میں کوئی اُصول وضع کرے، پھر ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہ قاعدہ یا اُصول متقدمین محدثین کے اقوال و اسالیب سے ثابت ہونے والے واضح قاعدے یا صریح منہج کے خلاف ہے تو کون اس بات میں تردد کرے گا کہ اس بارے میں اُن متقدمین کی بات ہی معتبر ہے جو اہل اصطلاح اور واضعین علم ہیں؟!!! یقیناً میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس بات میں اختلاف کرے کیونکہ میں ایسے طالب علم کا تصور بھی نہیں کر سکتا جسے علم کا ماخذ ہی معلوم نہ ہو۔

رہی بات ان لوگوں کی جو یہ کہتے ہیں کہ متاخرین علمائے حدیث مثلاً حافظ ذہبی، حافظ

عراقی، حافظ ابن حجر، حافظ سخاوی اور حافظ سیوطی رحمہ اللہ قواعد حدیث میں متقدمین کے منہج کو زیادہ جانتے ہیں، نیز انہوں نے متقدمین کے مذہب کی تائید کی ہے (لہذا متاخرین بھی حجت ہیں)..... ان کو میرا جواب یہ ہے کہ جب متاخرین متقدمین سے اختلاف کریں (اور یہ اختلاف صحیح حدیث کی تعریف سے لے کر مدح تک بہت زیادہ ہوا ہے) تو پھر فیصلہ کیا ہوگا؟ کس کی طرف رجوع کیا جائے گا؟ کیا بھلا متقدمین کے اسالیب، احکام اور اقوال ہی قابل اعتبار نہیں ہوں گے؟ یا ایسی باتیں کرنے والا شخص ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم متقدمین ائمہ کے اقوال میں غور و فکر کا دروازہ بند کر دیں؟ کتنی مشابہت ہے اس شخص کی مقلدین سے! ہم دلیل کی پیروی کرنے والے لوگ اپنے مذاہب کی تقلید کرنے والوں کے سامنے دلائل پیش کرتے ہیں اور ان کی ایسی باتوں سے بڑا متعجب اور ناراض ہوتے ہیں کہ ہمارا امام ان دلائل کو تم سے زیادہ جانتا تھا، ہر وہ دلیل جو ہمارے امام کے قول کے خلاف ہوگی وہ منسوخ یا مؤول ہوگی.....

لیکن میں بعض دلیل کے پیروکاروں کو دیکھتا ہوں کہ وہ اسی طرح کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ جب یہ شخص ہم سے متقدمین کے مناہج و اقوال میں غور و فکر کے دروازے کو بند کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ وہ خود اسی منہج کی تائید کرتا ہے تو پھر وہ اس منہج کی طرف دعوت دینے والوں پر کیا اعتراض کرتا ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ اصطلاحات حدیث میں منہج سلف کی طرف دعوت دینے والوں پر طعن کرنے والے شخص کو یہ حرکت شعوری یا لاشعوری طور پر اندھی تقلید کی طرف لے جائے گی۔ یوں دلیل کی طرف رجوع جو کہ سلفیت کی بنیاد ہے، منہدم ہو جائے گی۔ علوم حدیث کی تحقیقات میں ہمارے منہج کی مخالفت کرنے والے معاصرین کی یہ صورت حال ہمارے مشاہدے میں ہے۔

ہم تو اہل بدعت کے لیے مضحکہ بن جائیں گے کہ فقہی فروع میں تو اجتہاد کرتے ہیں جبکہ علوم حدیث میں تقلید کر رہے ہیں اور علمائے کرام کی عقیدے کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے پر تو راضی ہیں جبکہ مصطلحات حدیث میں ان کی غلطی کی نشاندہی پر ناراض ہوتے ہیں..... متاخرین کی علوم حدیث میں غلطیاں ہمیشہ ایسی نہیں ہوتیں جو عام غلطیوں کی طرح جزوی ہوں اور ان کا آسانی سے ادراک کیا جاسکے اور ان غلطیوں سے اس علم پر کوئی سنگین اثر نہ پڑے بلکہ ان میں سے بعض غلطیاں

ایسی ہیں جن کا نتیجہ خطرناک منہج غلطی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے.....

آخر میں میں ہر اس شخص کو نصیحت کروں گا جو متقدمین کے منہج کو زندہ کرنے کے شرف و اجر سے محروم ہے کہ وہ جلدی سے اس منہج پر عمل پیرا ہونے والے لوگوں کا ہم رکاب ہو جائے۔ منہج متقدمین وہ منہج ہے جس کے پیروکار اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ بھائی! تجھے حسد اور تکبر جیسی نفسانی خواہشات حق کی طرف رجوع کرنے سے روکے نہ رکھیں ورنہ حق اور اہل حق کے غلبے کی وجہ سے تیری پریشانی، غم اور گناہ میں اضافہ ہوتا جائے گا کیونکہ اگر باطل کی حکومت بھی آجائے تو حق ہمیشہ غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔ دلیل کا غلبہ ہر زمانے میں حق کو ہی حاصل ہوتا ہے۔“

(الحديث الحسن بين الحدّ والحجة لمحمد أحمد جلد: ص ۳۸-۴۲)

یہی ہماری دعوت ہے کہ متاخرین جس طرح عقیدے کے بعض معاملات میں علم کلام سے متاثر ہو کر متقدمین کے منہج سے ہٹ گئے ہیں، اسی طرح کئی معاملات میں فقہی مویشی گافیوں، علم منطق اور علم کلام سے متاثر ہو کر وہ علم حدیث اور اصول حدیث میں بھی غلطی کھا گئے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ جیسے ہم دیگر معاملات میں دلیل طلب کرنے کی روش اپناتے ہیں اسی طرح علوم حدیث میں بھی دلیل کے طالب ہوں اور صرف متاخرین کی کتب اصطلاح سے مرعوب ہو کر علم حدیث میں متقدمین کے منہج کو نہ چھوڑیں۔

آئندہ قسط میں ہم بیان کریں گے کہ متقدمین کسی ایسی حدیث کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے جس کی سب سندوں میں تھوڑا تھوڑا ضعف ہوتا تھا بلکہ اس حوالے ان کا طریقہ یہ تھا کہ فلاں حدیث کی سب سندیں ضعیف ہیں اور فلاں حدیث کے سب طرق میں تھوڑی تھوڑی کمزوری ہے وغیرہ۔ وہ ایسی حدیث کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے متقدمین محدثین کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی جائیں گی اور متقدمین اور متاخرین کے منہج کا موازنہ بھی کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ حق کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

